© rasailojaraid.com

تابوت

محمد اظہار الحق

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں میری مزدوری کی نوعیت ایسی تھی کہ ملک کے مختلف حصوں میں جانا پڑتا تھا۔ ان میں ملتان بھی شامل تھا۔ ایک بار وہاں پہنچا تو دوست دیرینہ خالد مسعود خان کو فون کیا اور بتایا کہ کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ شام کو خالد مسعود آئے تو ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ جو وضع قطع، لباس اور شرعی داڑھی میں کسی مسجد کا امام لگتا تھا لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا اندازہ نہ صرف غلط بلکہ احمقانہ تھا۔ مولوی نما نوجوان نہ صرف انگریزی زبان وادب کا پروفیسر تھا۔ بلکہ انگریزی اور اردو ادب کا ذوق بھی رکھتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا ذوق! گفتگو ساری سہ پہر اور پھر شام گئے تک جاری رہی اور جب وہ رخصت ہوا تو میں اسے یوں ملا جیسے ایک مرید، اپنے شیخ کو ملتا ہے۔

سید ذوالکفل بخاری سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد معمول یہ ہو گیا کہ جب بھی میں گرد وگرما گداو گورستان کے شہر ملتان پہنچتا تو مزدوری کی مکروہات سے فارغ ہوتے ہی ذوالکفل بخاری کے گھر کا رخ کرتا۔ کھانا بھی وہیں کھاتا، چائے بھی وہیں پیتا اور بار بار پیتا اور شہر بھر کے ادیبوں، شاعروں اور اہلِ علم سے بھی وہیں ملاقات ہوتی۔ ذوالکفل سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نواسہ تھا۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو ہمارے گھر میں کئی دوسرے ادبی اور سیاسی جرائد کے ساتھ ساتھ چٹان کا بھی غلغلہ تھا۔ والد گرامیؒ چٹان کی فائلیں سنبھال کر رکھتے جو آج ان کی رحلت کے بعد بھی موجود ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ چٹان پڑھنے والے اور شورش کاشمیری سے تعلق رکھنے والے کو عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقام اور مرتبے کا اندازہ نہ ہو۔ کسے معلوم تھا کہ بچپن میں چٹان سے عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے احراری رہنماؤں کی تصویریں کاٹ کاٹ کر البم بنانے والا بچہ جب بڑا ہوگا تو ملتان میں واقع ''دار بنی ہاشم'' اس کے لیے اپنا دروازہ، شفیق بازوؤں کی طرح وا رکھے گا۔ شاہ صاحب کے صاحبزادے، یعنی ذوالکفل کے ماموں بھی ہماری ادبی تقاریب میں شریک ہوتے اور یوں مجھے ان کی زیارت کے متعدد مواقع ملے۔ دنیا میں انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جسے مل کر آپ کو کوئی اشتباہ نہیں رہتا کہ یہ شخص جعلی ہے، بناوٹی ہے اور FAKE ہے۔ اس کا لباس جتنا بھی فاخرہ ہو، اس کی گفتگو جتنی مرصع ہو، وہ ملتے وقت اور رخصت ہوتے وقت جتنا بھی ڈرامہ کرے، گھٹنوں کے بل جھک جائے، دوہرا ہو جائے، آپ کے لیے آسمان سے ستارے توڑ لانے کا پکا وعدہ کرے، اپنی دیانت، بے نیازی، استغنا اور عظمت کا جتنا تذکرہ کرے، آپ کو دو جمع دو برابر ہے چار کی طرح ایک رتی بھر شبہ بھی نہیں رہتا کہ اس شخص سے ملنا اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا خدا کے عذاب سے کم نہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس سے مل کر آپ کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ شخص جتنا باہر سے متبرک ہے اتنا ہی اندر سے کھرا اور خالص چاندی کی طرح سفید اور چمکدار ہے۔ اس کے ماتھے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ستارہ صاف چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر سے ایک خوشبو پھوٹتی ہے جو اردگرد کے ماحول کو اپنے نشے میں لے لیتی ہے اور دل چاہتا ہے اس شخص کی معیت کبھی ختم نہ ہو۔ ذوالکفل اس دوسری قسم سے تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے نجابت، خلوص، خاندانی وقار، سچائی اور ایک مافوق الفطرت قسم کی شیرینی پھوٹتی تھی۔ انتہائی سادہ لباس میں ملبوس وہ شخص کسی بڑی اقلیم کے بادشاہ کی طرح بارعب اور متین لگتا تھا۔ جس محبت سے ملتا، اس محبت کے زرِ خالص ہونے کا انکار کرنا بڑے سے بڑے جوہری کے لیے ممکن نہیں تھا۔ استغنا اسے ورثے میں ملا تھا، دستِ سوال دراز کرنا تو دور کی بات ہے، وہ ایسا کوئی اشارہ بھی کرنے سے گریز کرتا جس سے کسی غرض کی طرف دور سے بھی راستہ نکلنے کا امکان ہوتا۔ پھر وہ سعودی حکومت کی دعوت پر وہاں کے محکمہ تعلیم میں خدمات سرانجام دینے چلا گیا۔ کبھی تعطیلات پر آتا تو فون پر بات ہوتی۔ ای میل پر ہمارا مسلسل رابطہ تھا پھر وہ واپس ہی آ گیا، لیکن حجاز کی خوشبو اس کے جسم سے جا نہیں رہی تھی۔ وہ پھر وہیں جانا چاہتا تھا اور اس طرح جانا چاہتا تھا کہ حرمین میں سے کسی ایک حرم کے نزدیک ہو۔

اس کوشش میں عرصہ ہی لگ گیا، اس اثنا میں جناب پروفیسر فتح محمد ملک نے مقتدرہ قومی زبان کے چیئر مین کا منصب چھوڑتے وقت، اپنے جانشین کے طور پر جو تین نام تجویز کیے، ان میں سرفہرست اس فقیر کا نام تھا۔ ملک صاحب کی منطق یہ تھی نفاذ اردو کے لیے زمین ہموار ہو چکی ہے اور اب مقتدرہ کا سربراہ کسی ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو بیوروکریسی سے، کسی احساس کمتری کے بغیر بات کر سکے اور افسر شاہی کے اندر اور باہر کو بخوبی جانتا ہو، ظاہر ہے حکومت کا ظاہری مرکز اسلام آباد لیکن اصل مرکز ملتان تھا۔ پینل میں شامل ایک اور دوست ملتان سے تھے اور نظریاتی طور پر بھی وہ اربابِ حل وعقد کو زیادہ راس آ سکتے تھے۔ میرا نام سرفہرست ہونے پر ذوالکفل بخاری کی مسرت کی انتہا نہ تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ پی آر میں صفر ہونے کی وجہ سے میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں، لیکن اس نے نظریاتی طور پر صف بندی کر لی اور میرے لیے کوششیں کرنے لگا۔ نظریاتی حوالے سے اپنے (اور میرے) کسی نہ کسی حوالے سے اسے مقتدرہ اور اوپر کے فیصلہ سازی کے مرکزوں کی خبریں ملتی رہتی تھیں اور وہ مجھے معاملے کی پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا۔ اس کی بے تابی سے بعض اوقات مجھے شبہ ہونے لگتا کہ مقتدرہ کے سربراہ کے لیے میرا نہیں، بلکہ اس کا نام زیرِ غور تھا! لیکن یہ محض اس کا خلوص، بے غرضی اور وہ بلند مقام تھا جس پر وہ شخصیت اور کردار کے حوالے سے فائز تھا! بعد میں یوں ہوا کہ اس فہرست میں سے وزیر اعظم نے کسی کو بھی نہ چنا اور قرعۂ فال ایک بار پھر دوستِ مکرم جناب افتخار عارف کے نام نکل آیا۔ ذوالکفل کو معلوم ہوا تو اس نے مجھے ٹیلی فون کیا۔ وہ بالکل بجھا ہوا اور خاموش سا تھا لیکن میں نے اسے یاد دلایا کہ اس میں ہمارے لیے ضرور کوئی بہتری ہوگی۔ اسے جب میں نے بتایا کہ جناب افتخار عارف کی تعیناتی میرے لیے انتہائی اطمینان کا باعث ہے کیونکہ میرے ذاتی تعلق کے علاوہ ان کا جو گہرا اور والہانہ تعلق والد گرامیؒ سے رہا اور ہے، اس کے پیش نظر وہ میرے لیے بہت محترم ہیں اور میں اس محبت اور احترام کو ایک لمحے کے لیے بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا جو جناب افتخار عارف کے باطن اور ظاہر میں والد گرامی کے لیے تھا۔ اس پر وہ لمحۂ یاس جو اس پر طاری تھا، گزر گیا۔

رواں سال کا کوئی ابتدائی مہینہ تھا۔ فروری یا مارچ، ٹھیک سے یاد نہیں، ذوالکفل کا فون آیا کہ وہ سعودی ویزے کے سلسلے میں اسلام آباد آ رہا ہے۔ وہ کام سے فارغ ہو کر میری قیام گاہ پر آ گیا۔ شام کو اس نے رخصت ہونے کی بہت کوشش کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن میں نے جانے نہ دیا۔ اس رات وہ میرے پاس ٹھہرا۔ میری اہلیہ اپنی بیٹی اور نواسوں کو ملنے لاہور گئی ہوئی تھی اور مجھے قلق تھا کہ ذوالکفل کی کما حقہ خاطر مدارت نہ ہو سکے گی۔ شام کو باتیں کرتے رہے اور احساس ہی نہ ہوا کہ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو اسلام کی روح کو روحِ عصر کے حوالے سے سمجھ سکتے تھے۔ اس کے ایک عقیدت مند نے ایک ملازمت کی پیشکش جب صرف اس وجہ سے ٹھکرانا چاہی کہ وہاں انگریزی لباس پہننا پڑتا تھا تو ذوالکفل نے اسے منع کیا اور سمجھایا کہ صرف لباس کی وجہ سے نہ جانا کہ بہت سے وہ کام کس طرح کیے جا سکیں گے ایک اچھا مسلمان ہی کر سکتا ہے۔

چند دن بعد اس نے مکہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے شمولیت کر لی۔ فون پر اس نے بتایا کہ اب وہ مکہ شریف میں رہائش پذیر ہے۔ خانوادہ آنے والا ہے اور یہ کہ میں اہل وعیال کے ساتھ آؤں تو خوب رونق رہے گی۔ اپریل میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں میرا جدہ جانا ہوا۔ میں عمرہ کے لیے حرم پہنچا تو ذوالکفل میرا منتظر تھا۔ عرب لباس میں وہ ایک وجیہہ شہزادہ لگ رہا تھا۔ جتنی دیر میں عمرہ کرتا رہا، وہ مقررہ جگہ پر انتظار کرتا رہا۔ عمرہ ختم ہوا اور حجام کے پاس گئے تو اس نے حجام سے قینچی لے کر میرے بالوں کی ایک لٹ اپنے ہاتھوں سے کاٹی۔ اس نے فاسٹ فوڈ ریستوران سے ڈھیر سارا کھانا خریدا اور ہم حرم کے جوار میں بیٹھ کر، پہروں باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن شام گئے وہ جدہ پہنچ گیا اور گردش زمانہ سے کچھ وقت ہم نے پھر چھین لیا۔ دو ماہ پہلے اس نے رمضان ملتان میں گزارا۔ فون پر بات ہوئی تو میں نے اصرار کیا کہ شاہ صاحب! اسلام آباد کو اپنے قدموں سے تھوڑی دیر ہی کو سہی، سرفراز فرما جایئے، لیکن ذوالکفل رمضان کے فوراً بعد مکہ مکرمہ واپس چلا گیا۔ دس بارہ دن پہلے میں گھر کے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف اخبارات کا پلندہ تھا اور دوسری طرف لیپ ٹاپ کھلا تھا۔ عجیب اداس اور پھیکی شام تھی۔ میں نے بیزار ہو کر سامنے پڑا ٹی وی بند کر دیا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ حافظ صفوان تھے۔ مجھے اچنبھا ہوا۔ حافظ صاحب ای میل پر ہر وقت رابطے میں رہتے ہیں لیکن فون پہلی بار آیا تھا۔ کاش نہ آتا! ذوالکفل شہرِ امن مکہ کی ایک گلی میں ٹریفک حادثے کی نذر ہو گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کروں، کس سے بات کروں، المیہ یہ تھا کہ رونا بھی نہیں آ رہا تھا۔ ملتان خالد مسعود کو فون کیا معلوم ہوا وہ امریکہ میں ہے۔ امریکہ کا فون لے کر وہاں اس سے بات کی لیکن ہزاروں دوستوں سے بھی بات کر لینے سے سینے کے اندر جو آگ سی لگی ہوتی ہے، کہاں بجھتی ہے! میں ڈرائنگ روم میں چلا گیا، جس جگہ وہ بیٹھا رہا تھا، وہاں بیٹھ کر اندھیرے میں آنسو بہائے۔ شائستگی، شرافت، حلم اور محبت کا ایک پیکر تھا، جو رخصت ہو گیا۔ کیا رومی نے دیوانِ شمس تبریز کا یہ شعر ذوالکفل ہی کے لیے نہیں کہا تھا؟

بروزِ مرگ چو تابوتِ من رواں باشد
گماں مبر کہ مرا فکرِ این و آں باشد

(روزنامہ نوائے وقت ۲۴، ۲۵/ نومبر ۲۰۰۹ء)

© rasailojaraid.com